قسط نمبر 6 آخری

مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر ''تدبر قرآن'' کے

تفسیری اصولوں کا جائزہ

تحریر: مولانا حافظ صلاح الدین یوسف (مشیر وفاقی شرعی عدالت پاکستان)

لغزش کا مرتکب کون، مفسرینِ اُمت یا فراہی گروہ؟

اصلاحی صاحب لکھتے ہیں: ''﴿اِنْ تَتُوْبَا اِلَی اللّٰہِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُکُمَا﴾ اس ٹکڑے کی تاویل میں ہمارے مفسرین سے سخت لغزش ہوئی ہے۔ انہوں نے ﴿صَغَتْ﴾ کے معنی کج ہونے کے، لیے اور تاویل یہ کی کہ اگر تم دونوں توبہ کرو تو یہی تمہیں کرنا چاہیے، اس لیے کہ تمہارے دل تو کج ہو چکے ہیں۔'' [تفسیر تدبر قرآن: ۸/ ۴۶۴] ہم عرض کریں گے کہ

اولاً: ہماری گزشتہ وضاحت کی روشنی میں بلاشک وشبہ کہا جاسکتا ہے کہ مفسرینِ امت اور مترجمینِ قرآن ہی کا موقف صحیح اور قرآن کے سیاق وسباق (یا فراہی گروہ کی اصطلاح میں نظم قرآن) کے عین مطابق ہے۔ سخت لغزش مفسرین سے نہیں ہوئی ہے بلکہ فراہی صاحب ہی اس کے مرتکب ہوئے ہیں کہ مجمع علیہ تفسیر سے انحراف کر کے شذوذ پر اصرار ہے جو سخت گمراہی ہے۔

ثانیاً: تمام مفسرین ومترجمین نے کج کے معنی نہیں کیے، تاہم تعبیری اختلاف سے قطع نظر مفہوم ومطلب سب نے یہی لیا ہے کہ تمہارا یہ عمل کہ تم دونوں بیویوں نے ایکا کر کے نبی کریم ﷺ کو ان کی پسندیدہ چیز کو ناپسندیدہ اور غیر مرغوب امر کو مرغوب سمجھنے پر مجبور کر دیا۔ اور ایسا اس لیے ہوا کہ تمہارے دل حق سے ہٹ گئے تھے اور اس امر کیلئے تم نے ایک سوچی سمجھی تدبیر اختیار کی، اب تنبیہ کے بعد اگر تم توبہ کا راستہ اختیار کرتی ہو تو یہ صحیح روش ہے۔ راہِ حق سے ہٹ جانے کا ازالہ توبہ ہی کے ذریعے سے ممکن ہے۔ لیکن یاد رکھنا اگر تم نے اس کے برعکس رویہ اختیار کیا اور اصلاح وتوبہ کی بجائے نبی کریم ﷺ کے خلاف جتھہ بندی کی ﴿وَ اِنْ تَظَاھَرَا عَلَیْہِ.....الخ﴾ تو پھر.....! اصلاحی صاحب فرماتے ہیں کہ اس تاویل میں کئی غلطیاں ہیں۔ پہلی غلطی یہ ہے کہ یہ تاویل عربیت کے بالکل خلاف ہے۔ لفظ ''صغو'' عربی میں کسی شے سے انحراف کے معنی میں نہیں بلکہ کسی شے کی طرف جھکنے اور مائل ہونے کے معنی میں آتا ہے۔ [حوالہ مذکور]

اصلاحی صاحب اور ان کے استاد فراہی صاحب نے اپنے بیان کردہ مفہوم کے اثبات کیلئے لمبی چوڑی بحث

کی ہے اور عربی اشعار (جاہلی ادب) کی بھرمار کی ہے۔لیکن ہمارے خیال میں وہ سب لاطائل ہیں۔جب یہ تسلیم ہے کہ اس کے معنی کسی شے کی طرف جھکنے اور مائل ہونے کے ہیں۔لیکن مائل ہونا اور جھکنا تو مطلق معنی ہیں، اس سے یہ کہاں ثابت ہو گیا یا کس طرح ثابت ہوسکتا ہے کہ حق ہی کی طرف مائل ہونا ہے، ناحق کی طرف مائل ہونا نہیں ہے؟ اس ایک پہلو کے تعین کی دلیل کیا ہے؟ ورنہ سیاق وسباق کے اعتبار سے دیکھا جائے گا کہ یہاں "صغو" کس کی طرف مائل ہونے کے معنی میں ہے، حق کی طرف یا ناحق کی طرف؟ اکثر مفسرین ومترجمین نے بھی یہاں "صغو" کے معنی مائل ہونے اور جھکنے ہی کے، لیے ہیں، جیسا کہ فراہی گروہ بھی اس کے معنی یہی بتلا رہا ہے۔لیکن یہاں فرق یہ آ گیا ہے کہ مفسرین نے سیاق وسباق یا نظم کے اعتبار سے معنی ناحق کی طرف مائل ہونے کے، لیے ہیں اور فراہی گروہ خلافِ سیاق یا خلافِ نظم حق کی طرف مائل ہونے کے معنی لے رہا ہے۔حالانکہ یہ گروہ نظم قرآن کا سب سے بڑا مدعی ہے لیکن یہاں سارا زور خلافِ نظم مفہوم کے اثبات میں لگایا جا رہا ہے!

ہم اپنے دعوے کے اثبات میں عربی اشعار پیش کرنے کے بجائے قرآن کریم ہی سے ایک مثال پیش کرتے ہیں جس میں "صغو" کا صیغہ ناحق کی طرف مائل ہونے ہی کے معنی میں ہے۔ملاحظہ فرمائیں:

"﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ O وَ لِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْئِدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَ لِيَرْضَوْهُ وَ لِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ﴾ [الانعام: ۱۱۲،۱۱۳]

"اور اس طرح ہم نے انسانوں اور جنوں کے اَشرار کو ہر نبی کا دشمن بنایا، وہ ایک دوسرے کو پرفریب باتیں القا کرتے ہیں دھوکا دینے کیلئے اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ یہ نہ کر پاتے تو تم ان کو ان کی انھی افترا پردازیوں میں پڑے رہنے دو۔اور ایسا اس لیے ہے کہ اس کی طرف ان لوگوں کے دل جھکیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور تا کہ وہ اس کو پسند کریں اور تا کہ جو کمائی انھیں کرنی ہے وہ کر لیں۔" [ترجمہ از تدبر قرآن: ۲/ ۵۱۴، ۵۱۵]

ان دو آیات کے مختلف ٹکڑوں کی تفسیر کا نقل کرنا تو باعث طوالت ہے، اس لیے ہم صرف آیت: ۱۱۳ ﴿وَ لِتَصْغٰٓى﴾ کی تفسیر "تدبر قرآن" ہی سے نقل کرتے ہیں اور غور فرمائیں کہ اس آیت میں "صغو" کس طرف جھکنے کے معنی میں ہیں.....! ﴿وَ لِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ.....﴾ اس کا عطف اس مفہوم پر ہے جو اوپر والے جملے سے نکلتا ہے، یعنی ہم نے شیاطین جن وانس کو انبیاء وصالحین کی مخالفت اور بدعات وخرافات کے القا کی یہ مہلت جو اس دنیا میں دی ہے یہ اس لیے دی ہے کہ اس سے ایک طرف حق پرستوں کی حق پرستی کا امتحان ہوتا ہے دوسری طرف باطل پرستوں کو ڈھیل

ملتی ہے اور وہ ان شیاطین واَشرار کے ہاتھوں اپنا من بھاتا کھاجا پا کر اس کی طرف راغب ہوتے ہیں، اس کو پسند کرتے ہیں اور اس دنیا میں جو کمائی کرنی ہے وہ کر لیتے ہیں..... ان لوگوں کی صفت یہاں ﴿اَلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْآخِرَةِ﴾ بتائی ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شیاطین واَشرار کی یہ دعوت انھی لوگوں کو اپیل کرتی ہے جو آخرت کے اعتقاد سے خالی ہوتے ہیں، ان کو مطلوب صرف یہ دنیا اور اس کا عیش ہوتا ہے اور اس کی سند ان شیاطین کے ہاتھوں ان کو مل جاتی ہے۔ ''اقتراف'' کے معنی کمائی کرنے کے آتے ہیں۔ قرآن میں یہ اچھے اور برے دونوں معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں بری کمائی کرنے کے معنی میں ہے۔'' [تفسیر تدبر قرآن: ۲/۵۲۰]

یہاں دیکھ لیں ''صغو'' (صَغِیَ یصغی اور صغی یصغو دونوں بابوں سے آتا ہے۔ سورۂ تحریم میں یہ صغی یصغو سے ہے اور یہاں صغی یصغی سے ہے) کے معنی جھکنے اور مائل ہونے ہی کے ہیں۔ لیکن کس کی طرف؟ حق کی طرف؟ جیسا کہ فراہی گروہ کا دعویٰ ہے۔ نہیں، یقیناً نہیں! یہاں یہ باطل کی طرف مائل ہونے اور جھکنے کے معنی میں ہے اور باطل کی طرف مائل ہونا، حق سے انحراف نہیں تو کیا ہے؟

یہاں اصلاحی صاحب نے ''صغو'' کا مفہوم یہی بیان کیا ہے کہ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے وہ شیاطین اِنس وجن کی باتوں اور باطل پرستوں کی طرف راغب ہوتے ہیں اور باطل کی طرف راغب ہونے کو حق کی طرف مائل ہونا نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے ''صغو'' کے معنی ''میل الی الشیء'' ہو تب بھی دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں۔ میل الی الحق بھی اور میل الی الباطل بھی۔ سیاق وسباق سے فیصلہ ہوگا کہ یہاں ''صغو'' میل الی الحق کے لیے ہے یا میل الی الباطل کے لیے۔ میل الی الباطل کیلئے ہوگا تو اس کو حق واعتدال سے انحراف ہی کہا جائے گا!

بنا بریں مفسرین امت اور مترجمین نے ﴿صَغَتْ قُلُوْبُکُمَا﴾ کے مفہوم میں جو حق وصواب سے ہٹ جانا مراد لیا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ نہ تو وہ عربیت کے خلاف ہے اور نہ اس میں ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی تنقیص ہے۔ جب کہ فراہی گروہ کا مفہوم عربیت کے بھی خلاف ہے، قرآن کے بھی خلاف ہے، نیز احادیث صحیحہ کی نفی پر مبنی ہے۔ علاوہ ازیں جب یہ دعویٰ ہے کہ ''صغو'' میل عن الشیء کیلئے نہیں، بلکہ میل الی الشیء کیلئے آتا ہے۔ یا اصلاحی صاحب کے الفاظ میں ''کسی شے سے انحراف کے معنی میں نہیں بلکہ کسی شے کی طرف جھکنے اور مائل ہونے کے معنی میں آتا ہے'' تو یہ معنی بھی چند مفسرین اور بعض مترجمین نے کیا ہے لیکن اس کا مفہوم انھوں نے جو بیان کیا وہ پہلے مفہوم ہی کے مطابق ہے جیسا کہ ہم نے گزشتہ سطور میں وضاحت کی ہے۔

اگر اصلاحی یا فراہی گروہ کو اسی مفہوم پر اصرار ہے تو اسے اتنا معرکہ آرا قرار دینے اور تمام مفسرین کو ''سخت

لغزش'' کا مرتکب باور کرانا قطعاً کوئی ضروری نہیں ہے، اسے میل الی التوبۃ کے مفہوم میں لیا جائے تو بات تو وہی توبہ کی رغبت اور اس کی تلقین ہی پر منتج ہوگی اور تمام مفسرین ومترجمین کا، لفظی اختلاف سے قطع نظر، یہی مقصود ہے، پھر اختلاف کیا؟ یہ تو نقطہ اتصال واتفاق ہے۔

اگر حق سے ہٹ جانے کے الفاظ سے اختلاف ہے تو یہ بات تو فراہی گروہ کے نزدیک بھی مسلّم ہے کہ افشائے راز کا معاملہ ہوا ہے، اس کا فروگزاشت ہونا بھی تسلیم ہے۔ اب اگر اس کے بعد دونوں ازواجِ نبی ﷺ کے اندر توبہ کا احساس پیدا ہو جس کا اظہار اللہ تعالیٰ نے بھی ﴿اِنْ تَتُوْبَا اِلَی اللّٰہِ﴾ میں فرمایا ہے تو آخر یہ احساسِ توبہ (میل الی التوبۃ) ہی تو ﴿فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُکُمَا﴾ کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس مفہوم کی مزید تائید اس کے بعد کے الفاظ ﴿وَ اِنْ تَظَاھَرَا عَلَیْہِ﴾ کی تہدید سے بھی ہو رہی ہے یعنی اگر توبہ کے بجائے تم نے نبی کریم ﷺ کے خلاف ایکا کیا تو اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر ﷺ کو تمہارا متبادل بھی عطا کر سکتا ہے۔ اس میں ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی توہین وتنقیص کیا ہے اگر وہ انسان ہی تھیں اور ان سے بشری کمزوری کے صدور کا صرف امکان ہی نہیں، بلکہ وقوع سے بھی انکار نہیں تو مفسرین کی تفسیر اور مترجمین کے تراجم پر

پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

اصلاحی صاحب نے مفسرین کی دوسری غلطی یہ بیان کی ہے کہ مفسرین کا مفہوم صحیح ہوتا:

''تو اس کیلئے یہ اسلوب بیان جو قرآن نے یہاں اختیار کیا ہے، بالکل ہی ناموزوں ہے۔''

[ص:۴۶۶] لیکن یہ بات ہماری سمجھ سے بالا ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مفسرین کا بیان کردہ مفہوم ہی قرآن کے اسلوبِ بیان کے مطابق ہے اور فراہی گروہ کا خود ساختہ مفہوم قرآن کے سیاق وسباق کے یکسر خلاف ہے۔ قرآن کے اسلوب کے خلاف تفسیر کرنے پر فراہی گروہ کا اصرار ہے لیکن اس کا الزام وہ مفسرین امت کو دے رہے ہیں۔ **یا للعجب!**

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

مفسرین کی تیسری غلطی؟

اصلاحی صاحب فرماتے ہیں: ''اس میں تیسری غلطی یہ ہے کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو بالکل بلاسبب دل کے زیغ وانحراف کا گناہ گار بنا دیا گیا ہے حالانکہ ہم نے الفاظِ قرآن کی روشنی میں واقعے کی جو نوعیت بیان کی ہے اس سے صاف واضح ہے کہ اس میں کسی پہلو سے کسی فسادِ نیت کا کوئی شائبہ نہیں ہے، بلکہ جو کچھ بھی ہوا، باہمی اعتماد محبت اور اخلاص کی بنا پر ہوا۔''

سوال یہ ہے کہ مفسرین نے کب یہ کہا ہے کہ یہ جو کچھ ہوا، فسادِ نیت کی وجہ سے ہوا؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا اخلاص ومحبت سے کیا گیا ہر عمل صحیح ہی ہوگا؟ اخلاص ومحبت سے کیے گئے کام میں غلطی کا امکان نہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر اصلاحی صاحب نے خود اس کو غلطی اور فروگزاشت کیوں قرار دیا ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ اخلاص ومحبت اور حسنِ نیت کے باوجود بہ تقاضائے بشریت غلطی کا صدور ہوسکتا ہے۔ تمام مفسرین اسی بات کے قائل ہیں کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے جو کچھ ہوا ہے، وُفورِ محبت ہی سے ہوا ہے۔ اس میں نہ فسادِ نیت کا کوئی دخل ہے اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچانے ہی کا کوئی جذبہ اس میں کارفرما رہا ہے۔ رضی الله عنهما

انکارِ حدیث کے نتیجے میں پیدا ہونے والے لطیفے یا بوالعجبیاں:

احادیث سے اعراض اور گریز کے قرآن کی من مانے طریقے سے تفسیر کرنا، نہ صرف یہ کہ یہ تفسیر بالرائے ہے جو مذموم اور ممنوع ہے، بلکہ اس سے نہایت دلچسپ لطیفے یا بوالعجبیاں سامنے آتی ہیں۔ علاوہ ازیں ایسے لوگ ''آسمان سے گرا، کھجور میں اٹکا'' کے مصداق متفق علیہ صحیح احادیث کا انکار کر کے ضعیف اور بے سروپا روایات کا سہارا لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ حالانکہ جب ان کے بہ قول احادیث حجت ہی نہیں ہیں تو پھر ضعیف اور موضوع روایات سے استدلال کیوں جو احادیث کی حجیت کے قائلین کے نزدیک بھی نا قابل حجت ہیں! بہرحال یہ بوالعجبیاں ہی ایسے لوگوں کا وطیرہ اور شعار ہیں۔ أعاذنا الله منها

اس کی ایک دلچسپ مثال زیر بحث آیت ﴿فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا﴾ کی تفسیر بھی ہے۔ اس کی وہ تفسیر جو فراہی گروہ نے احادیث کا انکار کر کے کی ہے، وہ آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ اس تفسیر کی رُو سے اس آیت کی مخاطب دو ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن ہیں۔ ثانیاً: ان سے جو افشائے راز ہوا، وہ راز کیا ہے؟ اس کی وضاحت (اس گروہ کے نزدیک) قرآن میں نہیں ہے۔ (حدیث میں تو ہے جس کو یہ گروہ نہیں مانتا!)

اس کی تفسیر ایک اور منکر حدیث قمر احمد عثمانی صاحب نے کی ہے جس کی رو سے اس آیت کی مخاطب منافقین اور کفار کی دو جماعتیں ہیں نہ کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن۔ ثانیاً: حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے راز کی بات بتائی تو اگر قصوروار کوئی ہوسکتا ہے تو صرف حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا ہی ہوسکتی ہیں نہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی۔ پھر اللہ نے دونوں کو مخاطب کر کے توبہ کی تلقین کیوں کی؟ ثالثاً: راز کی بات کس کو بتائی؟ قرآن میں اس کی کوئی تفصیل یا وضاحت نہیں تو ہم کون ہوتے ہیں کہ ایک کے جرم میں کسی دوسرے کو زبردستی شریک جرم بنا دیں۔ (اصلاحی صاحب کے نزدیک بھی اس راز کو اللہ نے

مبہم ہی رکھا ہے، اس راز کے ''درپے'' نہیں ہونا چاہیے۔ نیز وہ ازواج ہمارے لیے ماؤں کی منزلت میں ہیں، بیٹوں کیلئے یہ بات پسندیدہ نہیں ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی ماؤں اور باپوں کے درمیان کے رازوں کے کھوج میں لگیں۔ تدبر قرآن: ۸/۴۶۰] تاہم اس جرم میں اصلاحی صاحب نے کسی دوسری بیوی کے ''شریک جرم'' ہونے کو تسلیم کیا ہے۔ گو وہ بھی انکارِ حدیث کی بنا پر دونوں کے ناموں کی عدم صراحت کے قائل ہیں کہ قرآن نے دونوں بیویوں کے ناموں کا ذکر نہیں کیا لیکن وہ کہتے ہیں: ''اتنی بات واضح ہے کہ معاملہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے درمیان ہی کا ہے، کسی غیر کے سامنے کوئی افشائے راز نہیں ہوا۔'' [تدبر قرآن: ۸/۴۶۱]

رابعاً: قمر عثمانی صاحب نے نزدیک ﴿قُلُوْبُكُمَا﴾ میں خطاب کفار اور منافقین کی جماعتوں سے ہے جب کہ اصلاحی صاحب کے نزدیک دو ازواج نبی ﷺ سے ہے۔ ایک اور فرق ان دونوں (اصلاحی وعثمانی) مفسرین کے درمیان یہ ہے کہ اصلاحی صاحب کے نزدیک سورۂ تحریم کی پہلی آیت میں جس چیز کے حرام کرنے کا ذکر ہے، اس سے مراد شہد ہے جب کہ عثمانی صاحب کے نزدیک شہد والی روایت نا قابل اعتبار ہے۔ پھر نبی کریم ﷺ نے کس چیز کو حرام کیا؟ اس کی بابت قمر احمد عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''یہی بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ آیاتِ تحریم کسی ایسی ہی عورت یا چند عورتوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جنہوں نے اپنا نفس آپ کو ہبہ کرنا چاہا مگر آپ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی خوشنودی کی خاطر خود کو اس امر مباح سے باز رکھا۔'' [مطالعہ قرآن ص: ۱۲۱] ان منکرین حدیث کی بے بسی پر ہنسی بھی آتی ہے اور ان کی بدقسمتی پر رونا بھی۔ صحیح احادیث کو رد کرنے کے بعد ان بے چاروں کے پاس سوائے رائے و قیاس یا بے سند روایات کا سہارا لینے کے کوئی چارہ نہیں رہتا۔ دیکھیے! اس منکر حدیث نے بھی ایک تو رائے اور قیاس کا سہارا لیا کہ ''یہی بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ.....'' دوسرا سہارا ایک ضعیف اور بے سروپا روایت کا لیا ہے کہ ''یہ آیات ایسی ہی عورت یا چند عورتوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جنہوں نے اپنا نفس آپ کو ہبہ کرنا چاہا.....'' حالانکہ محققین نے وضاحت کی ہے کہ آیات تحریم کے نزول کا کوئی تعلق اپنا نفس ہبہ کرنے والی عورت سے نہیں ہے۔ حافظ جلال الدین سیوطیؒ لکھتے ہیں: "أخرج ابن أبي حاتم عن ابن عباس رضی اللہ عنہما، قال نزلت هذه الآية ﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ.....﴾ في المرأة التي وهبت نفسها للنبي ﷺ غريب أيضا و سنده ضعيف." [لباب النقول في أسباب النزول] ص: ۴۴۹ بتحقيق محمد بركات طبع ۲۰۱۰ء) ''الاستیعاب'' کے فاضل مؤلف اور محقق لکھتے ہیں:

و هذا سند ضعيف (في سنده) حفص بن عمر هذا ضعيف كما في "التقريب" قال

الحافظ ابن كثير عقبه: و هذا قول غريب."[الاستیعاب فی بیان الأسباب:۳/۴۳۷]

امام ابن العربی لکھتے ہیں:"أما من روى أن الآية نزلت في الموهوبة، فهو ضعيف في السند و ضعيف في المعنى. أما ضعفه في السند فلعدم عدالة رواته، و أما ضعفه في معناه فلأن رد النبيﷺ للموهوبة ليس تحريما لها، لأن من رد ما وهب له لم يحرم عليه انما حقيقة التحريم بعد التحليل."[أحكام القرآن:۴/۱۸۳۳. طبع أول ۱۹۵۸ء]

''موہوبہ والی روایت سند اور معنی کے اعتبار سے ضعیف ہے۔ سند کا ضعف یہ ہے کہ اس کے راویوں کی عدالت ثابت نہیں اور معنوی ضعف یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا موہوبہ عورت کا رد کرنا، اس کو حرام کرنا نہیں ہے، اس لیے کہ کوئی شخص اگر ہبہ کردہ چیز کو رد کردے تو وہ اس پر حرام نہیں ہوتی۔ کیوں کہ تحریم (حرام کرنے) کی حقیقت یہ ہے کہ پہلے وہ اس کیلئے حلال ہو اور پھر وہ اس کو حرام قرار دے لے۔''

صحیح روایات سے گریز اور بے سروپا روایات سے کردار کشی:

اصلاحی صاحب اور قمر احمد عثمانی صاحب کے مذکورہ فروق سے یہ واضح ہے کہ اصلاحی صاحب کے نزدیک یہ راز جو ایک بیوی نے دوسری بیوی کو بتلا دیا، خانگی زندگی اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے مابین تعلقات کے بارے میں تھا۔ لیکن عثمانی صاحب ایک دوسری بے سروپا روایت سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''اس راز کی بات کا تعلق خلافتِ شیخین جیسے کسی اہم معاملے ہی سے ہوسکتا ہے کہ اس کا تعلق پوری ملتِ اسلامیہ سے تھا اور کفار ومنافقین مدینہ اس کی وجہ سے بنو ہاشم اور دیگر قبائل قریش یا انصار ومہاجرین کو بھڑکا سکتے تھے اور عظیم فتنہ کھڑا کر سکتے تھے۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے بھی اپنی زوجہ محترمہ سے باز پرس کی جن کی زبان سے یہ راز کی بات کسی کے سامنے نکل گئی اور منافقین تک جا پہنچی۔''

دیکھیں کس طرح قیاس آرائیوں کے ذریعے سے قرآن کی تفسیر ہو رہی ہے! مثلاً: ''اس کا تعلق خلافتِ شیخین ہی سے ہوسکتا ہے'' یعنی ہے نہیں، ہوسکتا ہے۔ ''یہ راز کی بات کسی کے سامنے نکل گئی اور منافقین تک جا پہنچی۔'' گویا زوجہ محترمہ نے یہ راز کی بات باہر مجمع عام میں کردی، ورنہ گھر کی بات گھر ہی میں کسی سے کرنے سے تو منافقین تک نہیں پہنچ سکتی تھی، لازماً ماننا پڑے گا کہ مجمع عام میں، بلکہ ایسے مجمع میں جس میں مسلمانوں کے علاوہ منافقین وغیرہ بھی ہوں گے، یہ راز افشا کر دیا گیا۔ فنعوذ باللہ من ذلک!

اس آیت کی تفسیر میں وارد صحیح روایات سے تو ان منکرین حدیث کے نزدیک ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کا کردار داغ دار ہوتا ہے لیکن بے سروپا روایات کی بنیاد پر جو تفسیر کی جارہی ہے، ان سے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کا جو یہ کردار سامنے آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا راز ان کے ذریعے سے منافقین تک پہنچ گیا، کیا یہ ان کے کردار کے مطابق ہے؟ کیا اس میں ان کی تنقیص نہیں؟ بلکہ اس سے بھی زیادہ نہیں؟ علماء تو ان کو اس لیے تسلیم کرتے ہیں کہ وہ روایات صحیح سند سے ثابت ہیں، اس لیے ان میں کوئی شائبہ تنقیص نہیں۔ ان میں ان کی ایک بشری کمزوری کا ذکر ہے جس سے قطعاً ان کی تنقیص لازم نہیں آتی۔ لیکن بے سروپا روایات سے ان کی جو منظر کشی کی جارہی ہے، وہ سراسر ان کی توہین ہے کیونکہ ان کا کوئی ثبوت ہی نہیں ہے۔ اس اعتبار سے یہ ان پر اتہام بھی ہے اور ان کی کردار کشی بھی۔

خلافتِ شیخین والی بات کیا واقعی بے سروپا ہے؟

باقی رہی یہ بات کہ کیا خلافتِ شیخین والی روایت واقعی بے سروپا ہے؟ ہاں، یقیناً وہ یکسر بے سروپا ہے۔ اسی لیے اکثر مفسرین نے اس کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ اگر بعض مفسرین نے کیا بھی ہے تو ساتھ ہی اس کے ضعف کی وضاحت بھی کر دی ہے، چنانچہ ''الاستیعاب'' کے مؤلف اس روایت کے بارے میں لکھتے ہیں: ''**سنده ضعيف جدا.**'' اس کی سند بالکل ضعیف ہے۔'' پھر لکھتے ہیں کہ اس میں تین علتیں ہیں:

1۔ یہ ہشام بن ابراہیم کے طریق سے مروی ہے: **لم نجد له ترجمة.** ''ہمیں اس کا ترجمہ، یعنی حالات ہی نہیں ملے۔''

2۔ اس میں ایک راوی موسیٰ بن جعفر ہے جس کے بارے میں امام عقیلی نے کہا ہے: ''**مجهول بالنقل لا يتابع على حديثه و لا يصح اسناده.**''

''وہ مجہول (نامعلوم) ہے، اس کی حدیث کی متابعت نہیں کی جاتی اور نہ اس کی اسناد ہی صحیح ہوتی ہے۔''

3۔ موسیٰ بن جعفر اپنے عم (چچا) سے روایت کرتا ہے۔ اس کے چچا کے بارے میں محققین لکھتے ہیں: حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا قول: ''**لم أقف على اسمه و لا عرفت حاله.**'' [لسان الميزان: ٦/١١٤]

''(یہ عم (چچا) کون ہے؟ نہ میں اس کے نام سے آگاہ ہوا، اور نہ اس کے حال سے۔''

امام عقیلی نے کہا: ''**لا يصح اسناده.**'' اس کی اسناد ہی صحیح نہیں ہے۔''

امام ذہبی نے کہا: ''**مجهول و خبره ساقط**''

''یہ مجہول ہے اور اس کی روایت ساقط، یعنی غیر معتبر ہے۔'' ''**و قال السيوطي في "الدر المنثور" و"لباب النقول" [ص: ٢١٧] بعد أن زاد نسبته لابن مردويه: "بسند ضعيف." [الاستيعاب في**

بیان الأسباب: ۴۳۶/۳]"الدر المنثور اور لباب النقول میں امام سیوطی نے ابن مردویہ کی طرف تخریج روایت کی اضافی نسبت کے بعد کہا ہے کہ یہ ضعیف سند سے مروی ہے۔"

ایک اور نہایت دلچسپ لطیفہ یا دعوائے "نظم قرآن" کی حقیقت:

ایک اور نہایت دلچسپ لطیفہ ملاحظہ ہو جس سے "نظم قرآن" کی ضرورت سے زیادہ اہمیت بیان کرنے کی حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اصلاحی صاحب کی زیر بحث آیت کی تفسیر اور منکرِ حدیث عثمانی صاحب کی تفسیر، دونوں میں نہایت واضح فرق اور ایک دوسرے کے مخالف ہے۔ حالانکہ دونوں کی بنیاد صحیح روایت کے انکار پر ہے اور اس انکار کے بعد ایک کی تفسیر کی بنیاد اٹکل پچو، ظنون واَوہام پر ہے اور دوسرے کی تفسیر بے بنیاد روایت پر، جیسا کہ گزشتہ سطور میں وضاحت گزری۔ اس میں نہایت دلچسپ لطیفہ یہ ہے کہ دونوں حضرات کا دعویٰ ہے کہ ان کی تفسیر "نظم قرآن" کے عین مطابق ہے۔ لیکن قمر احمد عثمانی صاحب اپنی تفسیر کی بابت، جو اصلاحی تفسیر کے مخالف ہے، یہ دعویٰ فرماتے ہیں: "اگلی آیات ﴿قُوْا اَنْفُسَكُمْ.....﴾ [آیات: ۶۔۹] میں ہماری انہی تعبیرات کی تائید ہو رہی ہے اور ان میں وہ تمام تر معنوی ربط بھی موجود ہے جو دیگر تعبیرات وتفاسیر میں مفقود ہے۔" [مطالعہ قرآن، ص: ۱۳۰۔ کتاب پر نہ تاریخ طبع درج ہے اور نہ کسی ناشر یا ادارے کا نام]

جب کہ اصلاحی صاحب کی مذکورہ آیت کی تفسیر قمر احمد عثمانی صاحب کی تفسیر سے مختلف ہونے کے علاوہ ان کے نزدیک اگلی آیات (۶ تا ۹) کا کوئی تعلق بھی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے نہیں ہے، چنانچہ اصلاحی صاحب فرماتے ہیں: "پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے احتساب کے بعد یہ عام مسلمانوں کو جھنجھوڑا ہے.....الخ۔" اس پہلو کی وضاحت سے ہمارا مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ احادیث اور شانِ نزول کی صحیح روایات سے اعراض کر کے جو بھی تفسیر کی جائے گی، وہ تفسیر بالر أی المذموم ہی ہوگی۔ حدیثی یا تفسیری روایات کے خلا کو نہ نظم قرآن کے دعوے سے پر کیا جا سکتا ہے، نہ کلام عرب کی اہمیت کی دُہائی سے، نہ ظنون واَوہام سے اور نہ بے سروپا روایات سے۔ بلکہ تفسیر قرآن میں ان دعووں کا مقصد یا ان کی اہمیت پر ضرورت سے زیادہ زور یا انہی پر انحصار، یہ سب انکارِ حدیث کے چور دروازے، یا بہ لطائف الحیل ان سے انحراف کے راستے ہیں اور منحرفین اور مضلّین کو ان کی ضرورت اس لیے ہے کہ ان کے بغیر ان کے خود ساختہ گمراہ کن نظریات کا اثبات ممکن نہیں ہے۔

اصلاحی یا فراہی اصول تفسیر سے مقصود حدیث کا انکار ہے!

ہمارے اس دعوے کے واضح دلائل وہ تفصیلات ہیں جو گزشتہ مباحث میں گزریں، ہم نے الحمد للہ اللہ تعالیٰ

کی توفیق سے اس پہلو کو خوب واضح کر دیا ہے کہ اصلاحی صاحب نے تفسیر قرآن میں جن جن چیزوں کو زیادہ ضروری قرار دیا ہے، وہ سب انکارِ حدیث کا شاخسانہ ہیں اور ان سے مقصود فراہی گروہ کا حدیث سے جان چھڑا کر من مانے نظریات کا اثبات ہی ہے۔ اس کی ایک اور نہایت واضح مثال ملاحظہ فرمائیں:

سورہ قیامہ کی دو آیات ہیں: ﴿وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾[القیامة: ۲۲،۲۳] سب مفسرین و مترجمین نے ان کا ترجمہ کیا ہے: ''بہت سے چہرے اس (قیامت کے) روز تر و تازہ ہوں گے۔ اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے یا دیکھنے والے ہوں گے۔'' اور اس ترجمے کی بنیاد ظاہری الفاظ کے علاوہ وہ احادیث ہیں جن میں اہل ایمان کو یہ بشارت دی گئی ہے کہ وہ جنت میں اپنے رب کا اپنی آنکھوں سے دیدار اور مشاہدہ کریں گے۔

لیکن معتزلہ قدیم چونکہ جنت میں بھی رؤیتِ باری تعالیٰ کے قائل نہیں اس لیے انھوں نے اس سے متعلقہ تمام روایات کا بھی انکار کر دیا۔ اسی فکری گمراہی کو معتزلہ جدید (فراہی گروہ) نے بھی اختیار کیا ہے اور رؤیت باری تعالیٰ کی تمام صحیح اور متفق علیہ روایات کو نظر انداز کر دیا۔ لیکن چونکہ قرآن کے الفاظ اس مفہوم کے لیے نہایت واضح ہیں، اس لیے اس فراہی گروہ (اصلاحی صاحب سمیت) نے اس کے ترجمے میں معنوی تحریف کر کے اس کا حسبِ ذیل ترجمہ کیا ہے: ''کتنے چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے۔ اپنے رب کی رحمت کے متوقع۔'' [تدبر قرآن: ۹/۷۷] اس میں معنوی تحریف یہ ہے کہ قرآن میں ﴿اِلٰى رَبِّهَا﴾ ہے، ''الی رحمة ربک'' نہیں ہے۔

ثانیاً: ﴿نَاظِرَةٌ﴾ ''منتظرة'' نہیں ہے۔ دونوں لفظوں کے معنی بدل دیے گئے ہیں، صرف اس لیے کہ رؤیتِ باری تعالیٰ کی احادیث کو کالعدم کر دینا آسان ہو جائے۔ اس لیے ﴿اِلٰى رَبِّهَا﴾ کے درمیان میں لفظ ''رحمة'' کا اضافہ کر دیا اور ﴿نَاظِرَةٌ﴾ کو ''منتظرة'' بنا دیا اور مفہوم یہ بیان کیا کہ ''﴿اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ کے معنی ہیں: وہ اپنے رب کی رحمت و عنایت کے متوقع و منتظر ہوں گے۔'' [۹/۹۰] شاید کوئی شخص یہ کہہ دے کہ آگے انھوں نے رؤیتِ باری کے بارے میں وضاحت کی ہے، اس لیے ان کو منکر نہیں کہا جا سکتا۔ تو لیجیے اس مسئلے پر ان کی وضاحت بھی ملاحظہ فرما لیں اور پھر فیصلہ کر لیں کہ وہ رؤیتِ باری تعالیٰ کی احادیث کے منکر ہیں یا ان کو ماننے والے؟ اصلاحی صاحب فرماتے ہیں: ''﴿اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ سے بعض لوگوں نے رؤیت باری تعالیٰ پر استدلال کیا ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ آیت اس مسئلے سے تعلق رکھنے والی نہیں ہے، بلکہ یہ بالکل ہی دوسرے موقع و محل کی آیت ہے۔ اسی طرح جن لوگوں نے رویتِ باری تعالیٰ کی مخالفت کی ہے اور اس مخالفت کے جوش میں ﴿اِلٰى﴾ کے معنی ہی بدل دیے

ہیں، ان کی رائے بھی ہمارے نزدیک بالکل غلط ہے۔ رؤیتِ باری تعالیٰ کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ اس دنیا میں تو ہمارا ایمان ایمان بالغیب ہے، ہم اپنے رب کو اس کی آیات اور نشانیوں کی اوٹ ہی سے دیکھ سکتے ہیں لیکن آخرت میں ہمارا دیکھنا بالمشاہدہ ہوگا اور ہر حقیقت کے باب میں ہمیں حق الیقین کا مرتبہ حاصل ہوگا۔ رہا یہ سوال کہ اس مشاہدے کی نوعیت کیا ہوگی تو اس کی حقیقت اس دنیا میں معلوم نہیں ہوسکتی۔ یہ چیز متشابہات میں داخل ہے اور متشابہات میں تعمق جائز نہیں ہے۔ اللہ جل شانہ یہ جانتا ہے کہ اس مشاہدے کی نوعیت کیا ہوگی۔''

[تدبر قرآن: ۹/۹۱]

حالانکہ احادیث میں اس مسئلے کو اس طرح واضح کر کے بیان کیا گیا ہے کہ جس میں کوئی اشتباہ نہیں رہتا۔ جیسے ایک حدیث میں ہے کہ ''جس طرح تم میں سے ہر شخص سورج کو دیکھتا ہے، اس کے دیکھنے میں نہ کوئی ہجوم ہوتا ہے اور نہ کوئی حجاب۔ اسی طرح ہر جنتی اپنے رب کو دیکھے گا'' اور یہ احادیث صحیح ترین اور متفق علیہ ہیں۔ فن کاری دیکھیے کہ احادیث کا واضح الفاظ میں انکار کرنے سے تو گریز کیا گیا ہے لیکن ان کو ''متشابہات'' قرار دے کر بے حیثیت کر دیا گیا۔ اس پر مزید رَدّے پر رَدّہ چڑھا دیا کہ ''متشابہات میں تعمق جائز نہیں۔'' اسے کہتے ہیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ حیلہ ایسا اختیار کیا کہ کوئی انکارِ حدیث کا الزام بھی نہ دھر سکے اور حدیث کا انکار بھی ہو جائے۔ لیکن اہلِ نظر نقش پا کی شوخی ہی سے سب کچھ سمجھ لیتے ہیں ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش
من اندازِ قدت را مے شناسم

خلاصہ مباحث:

یہاں تک ایک اصولی بحث تھی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اصلاحی صاحب نے جتنے بھی اصول قائم یا بیان کیے ہیں، ان سب کی تان بالآخر انکارِ حدیث ہی پر آ کر ٹوٹتی ہے اور ان سے شعوری یا غیر شعوری طور پر احادیث کا انکار ہی لازم آتا ہے اور ان کا مقصود بھی بہ ظاہر یہی ہے کیونکہ احادیث کے انکار کے بغیر فراہی گروہ کے خود ساختہ گمراہ کن نظریات کا اثبات ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کو الحمدللہ مثالوں کے ذریعے سے واضح اور مبرہن کر دیا گیا ہے تاکہ ﴿لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّ يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ﴾ [الانفال: ۴۸]